حواشی

۱۔ تدبر قرآن جلد اول ص ۲۰۶ مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن لاہور
۲۔ " " ص ۲۱۱
۳۔ " جلد ہفتم ص ۲۸۰
۴۔ " " ص ۲۸۶-285
۵۔ " جلد سوم ص ۴۴۳
۶۔ " " ص 451
۷۔ " جلد اول ص ۴-۴۰۳
۸۔ " جلد پنجم ص ۱۴۵
۹۔ " " ص ۱۴۹
۱۰۔ تفسیر سورہ ذاریات، مولانا حمید الدین فراہیؒ
ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح مطبوعہ
کوہ نور پریس، دہلی۔ ص: ۱۳۴
۱۱۔ تدبر قرآن جلد چہارم ص ۱۹۵ مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن لاہور
۱۲۔ " " ص ۱۹۴
۱۳۔ مختار الصحاح ص ۹۸
۱۴۔ تدبر قرآن جلد دوم ص ۲۴۴
۱۵۔ " جلد چہارم ص ۱۹۷
۱۶۔ " " ص ۲۰۴
۱۷۔ تدبر قرآن جلد چہارم ص ۸۸-۱۸۷
۱۸۔ " " ص ۹۱-۱۹۰

۱۹۔ الکشاف جلد دوم ص ۲۴۲ مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت
۲۰۔ الکشاف جلد دوم ص ۲۴۱
۲۱۔ دیوان الحماسہ شرح تبریزی جز ثانی مطبوعہ عالم الکتب بیروت
۲۲۔ علی محمد النحوی الہروی کتاب الازھیۃ فی علم الحروف (تحقیق عبدالمتین الملوحی) مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق، ۱۹۷۱ء ص ۱۱۸-۱۱۷
۲۳۔ مختار الصحاح ص ۱۶۳ مادہ ط، ر، ح
۲۴۔ اقرب الموارد ص ۷۰۰ مادہ ط، ر، ح
۲۵۔ تدبر قرآن جلد چہارم ص ۲۳۴
۲۶۔ المصباح المنیر مادہ ح، ر، ض

تدبر قرآن میں لغوی تحقیق

ابو سفیان اصلاحی

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے علمی اکتسابات میں سب سے نمایاں مقام ان کی مایہ ناز تصنیف تدبر قرآن کو حاصل ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ اس تفسیر کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ نظم کے رہنما اصول کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ اس سے پہلے بھی متعدد تفاسیر میں نظم کی رعایت پائی جاتی ہے اور کئی مفسرین نے قرآن مجید کے معانی و مفاہیم کی تشریح و ترجمانی میں اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ از اول تا آخر جس طرح اس تفسیر میں تصور نظم قرآن کی روح جاری و ساری ہے۔ اس کی مثال کہیں اور دستیاب نہیں ہے۔ اس تفسیر کی دوسری نمایاں خصوصیت میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قرآن مجید میں استعمال ہونے والے الفاظ کی لغوی، مرادی اور اصطلاحی معانی کی بھرپور اور مدلل تشریح کی گئی ہے۔ اس ضمن میں بعض الفاظ کے ارتقاء کا تاریخی پس منظر بھی بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ لفظ ابتداءً اور اصلاً کس زبان سے تعلق رکھتا ہے، وقت کے ساتھ اس کے مدلول و مفہوم میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں اور قرآن مجید میں وہ کن معانی میں استعمال ہوا ہے۔ الفاظ کی تحقیق میں وہ اشعار عرب سے بھی استشہاد کرتے ہیں اور خود قرآن مجید میں اس کے استعمال کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ تدبر قرآن کا یہ بہت ہی نمایاں اور ممتاز پہلو ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی الفاظ کے معانی و مفاہیم کی تعیین میں جن مصادر سے استفادہ کرتے ہیں ان میں لسان العرب، جمہرۃ اشعار العرب، سبع معلقہ، حماسہ اور مختلف شعراء کے دواوین شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کو اس ضمن میں اپنے گرامی قدر

استاذ کی تصانیف سے بہت مدد ملی ہے۔ مولانا فراہی نے اپنی مختلف تصانیف بالخصوص مفردات القرآن، تفسیر نظام القرآن، اقسام القرآن اور اسالیب القرآن وغیرہ میں نہ صرف لغوی تحقیق کا بڑا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بے شمار الفاظ کی نہایت دقت نظر سے لغوی تحقیق کی ہے۔ مولانا اصلاحی کا الفاظ کی لغوی تحقیق کا طریقہ اور منہج دراصل مولانا فراہیؒ سے مستعار ہے۔

ایک مختصر مقالہ میں مولانا اصلاحی کی بے شمار لغوی تحقیقات کا احاطہ ممکن نہیں ہے چنانچہ یہاں مطالعہ کے لئے صرف کچھ الفاظ ہی کا انتخاب کیا گیا ہے۔ سہولت کے پیش نظر ان الفاظ کو چھ بنیادی عناوین کے تحت تقسیم کیا گیا ہے اور نمونہ کے طور پر ہر عنوان سے چند الفاظ کو مطالعہ کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس سے مولانا کی لغوی تحقیقات کے انداز، منہاج اور قدر و قیمت کا کسی قدر اندازہ لگایا جا سکے گا۔ سب سے پہلے ان الفاظ کا ذکر کیا جائے گا جس کا تعلق ذات و صفات باری تعالیٰ سے ہے۔ اس کے بعد ان الفاظ کو پیش کیا جائے گا جو آنحضور ﷺ کی شان میں وارد ہوئے ہیں پھر ان الفاظ سے بحث کی جائے گی جو خود قرآن کریم کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد عبادات اور روحانیات سے متعلقہ الفاظ زیر بحث آئیں گے۔ اس کے بعد وہ الفاظ لائے جائیں گے جو کفر و شرک اور ظلم و عدوان کے زمرے میں آتے ہیں۔

صفات الٰہی سے متعلقہ الفاظ: پورا قرآن کریم خداوند قدوس کی وحدانیت کا شاہد ہے، معنوی اور لفظی امتیاز سے قرآن کریم میں جگہ جگہ اللہ کی صفات بیان کی گئی ہیں(۱) اور یہ واضح تصور موجود ہے کہ وہ دنیا کی تمام چیزوں کا خالق اور رازق ہے، وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے اور تمام اشیاء اس کی محتاج ہیں۔ یہاں پر ذات و صفات الٰہی سے متعلق چند الفاظ پیش کئے جائیں گے۔ مثلاً: قائم بالقسط، متوفی، رب، الٰہ، رحمان، رحیم، مھیمن، حی، قیوم، صمد، ملکوت، غفور، علیم، قدیر، سمیع، بصیر، مالک یوم الدین، خالق، خیر الماکرین، عزیز، حکیم، سریع الحساب، مالک الملک، رؤف، غنی، لطیف اور خبیر وغیرہ۔ مذکورہ صفات میں سے صرف چھ صفات موضوع بحث آئیں گی۔

"رحمان اور رحیم" کے باب میں صاحب تدبر قرآن لکھتے ہیں:

"اسم رحمان، غضبان اور سکران کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے، اور اسم رحیم، علیم اور کریم کے وزن پر صفت کا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رحیم کے مقابل میں رحمان میں زیادہ مبالغہ ہے اس وجہ سے رحمان کے بعد رحیم کا لفظ ان کے خیال میں ایک زائد لفظ ہے۔ جس کی چنداں ضرورت تو نہیں تھی لیکن یہ تاکید مزید کے طور پر آگیا ہے، ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے استعمالات کے لحاظ سے فعلان کا وزن جوش و خروش اور ہیجان پر دلیل ہوتا ہے اور فعیل کا وزن دوام و استمرار اور پائداری استواری پر اس وجہ سے ان دونوں صفتوں میں سے کوئی صفت بھی برائے بیت نہیں ہے بلکہ ان میں سے ایک خدا کی رحمت کا جوش و خروش کو ظاہر کرتی ہے دوسری اس کے دوام اور تسلسل کو۔"

قرآن کریم میں اللہ کی ایک صفت "قائم بالقسط" بتائی گئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تنہا پوری کائنات کے نظام کو قائم کرنے والا ہے، تمام اختیارات اور تصرفات اسی کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے اختیارات اور تصرفات میں کوئی جھول اور کسر نہیں ہے۔ تمام چیزیں عدل و قسط پر مبنی ہیں۔ مولانا اصلاحی لفظ قسط کے متعلق اپنی تحقیق ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں، قسط کا مفہوم وہی ہے جو عام بول چال میں حق، عدل انصاف وغیرہ کے الفاظ ادا کرتے ہیں اس کا ضد ظلم، جور اس معنی کے دوسرے الفاظ ہیں، فکر، عمل، قول، اخلاق، کردار، مظاہر اور اشکال، غرض ظاہر و باطن کے ہر گوشے میں ایک نقطہ تو وہ ہے جو ہر چیز کے خالق و فاطر کی بتائی ہوئی فطرت اور اس کے مقرر کئے ہوئے حدود و قیود کے اندر ہے اس نقطۂ اعتدال یا بالفاظ دیگر مرجع عدل و قسط سمجھتے۔ اگر کسی گوشے میں اس نقطہ سے سوشہ کے برابر بھی انحراف واقع ہو جائے تو یہ بات عدل و قسط کے منافی ہو گی۔ اعتبارات اور نسبتوں کی تبدیلی سے تعبیرات بدل

جائیں گی۔ کسی دائرے میں ہم اس انحراف کو ظلم وجور سے تعبیر کریں گے کسی گوشے میں بد صورتی اور بد نیتی سے۔ اس طرح کسی پہلو میں اس اعتدال کو حق وعدل سے تعبیر کریں گے۔ کسی محل میں حسن وجمال سے۔ لیکن اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہو گی۔ وہ یہ کہ ایک شے اپنے اصل مقام سے ہٹ گئی تو بگاڑ پیدا ہو گیا اور اگر اپنے جوڑ سے پیوست ہو گئی تو بناؤ نمودار ہو گیا۔(۳)

اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "چونکہ اس کائنات کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اس لئے وہ اس کے نظام میں بناؤ چاہتا ہے کہ فساد و بگاڑ، نظام تکوینی کی چول سے چول اسی طرح بٹھائی ہے کہ کہیں کوئی رخنہ نظر نہیں آتا۔ اگر کہیں کوئی کمی نمودار ہوتی تو وہ خود اس کو دور کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے تاکہ اس کائنات کا توازن بر قرار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان کو اس نے ایک محدود آزادی دی ہے۔ اگر انسان اپنے دائرۂ آزادی سے باہر نکلتا ہے تو وہ ذات اپنے توازن کو بر قرار رکھنے کے لئے اس پر قدغن لگاتا ہے اور انسان کے پیدا کردہ بگاڑ کو درست کرتا ہے۔ کیونکہ وہ قائم بالقسط ہے۔ اسی قیام بالقسط کے پیش نظر اس نے مکافات عمل کا قانون صادر کیا۔ انبیاء اور شرائع نازل کئے، بدعات اور خرافات کی اصلاح کے لئے مجددین و مصلحین پیدا کئے۔ قوموں کے عروج وزوال ایجاد کئے اور اسی کے لئے روز حساب مقرر کیا۔ یہ تمام چیزیں اس کے قیام بالقسط کی شہادت پیش کرتی ہیں۔"(۴)

قائم بالقسط پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے اپنے استاذ گرامی کی رائے کو بھی پیش کیا ہے کہ ایمان بالقسط ایمان کے اہم ارکان میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فطرت کو عدل و قسط کے اصولوں پر استوار کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عدل و قسط کو پسند کرنے والا اور اس کو قائم کرنے والا ہے، ایمان بالقسط کی ایک دوسری شکل یہ ہے کہ ہم اپنے معبود سے محبت کرتے ہیں اور اس کی رضا کے طلبگار ہوتے ہیں۔ یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جب یہ ہمیں کامل یقین ہو کہ وہ ظلم و ناانصافی کے تمام شائبہ سے پاک ہے۔ اس کی تیسری صورت یہ ہے کہ اس کے انعامات واحسانات کو دیکھتے ہوئے ہمارے اندر شکر کا

جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں شرک کو کفر اور ایمان کو شکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی اصول پر تمام حقوق کے استحقاق کی بنیاد عدل کے وجوب پر رکھی گئی ہے، شریعت اسلامی کی اساس بھی قسط پر ہے۔ ایمان بالقسط کا چوتھا ثمرہ یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے کیونکہ وہی ضلالت و گمرہی سے انسان کو نکالتا ہے۔ ضلالت سے انسان کو اسی وقت نجات مل سکتی ہے جب یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ قائم بالقسط ہے۔ اس کا ہر حکم عدل اور ہر وعدہ سچا ہے(۵) جیساکہ اس نے فرمایا ہے :"تمت کلمة ربك صدقا و عد لا۔"

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان میں ایک صفت "متوفی" ہے۔ "توفی" کے اصل معنی عربی لغت میں "الاخذ بالتمام" ہے، کسی چیز کو پورا پورا لینے یا کسی چیز کو اپنی طرف قبضہ کر لینے کے ہیں۔ موت دینے کے معنی میں اس لفظ کا استعمال حقیقۃً نہیں بلکہ مجازاً ہوا ہے۔ ایسے الفاظ جو اپنے حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، اپنے صحیح مفہوم کے تعین میں قرائن کے محتاج ہوتے ہیں(۶) یہاں چند ایسے قرائن ہیں جن کی بنیاد پر موت دینے والے کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا، ایک قرینہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اس موقع پر بشارت دی ہے اور نصرت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی سنت رہی ہے کہ جب انبیاء اور رسل کو ان کی اقوام نے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی حفاظت اور نصرت کی بشارت دی ہے، دوسرا قرینہ یہ ہے کہ اگر یہاں موت دینے والے کا مفہوم لیا جائے تو رافع الیّ کے الفاظ یہاں بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ کیونکہ یہ کہنا کہ ہم کو موت دینے والا اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں متضاد ہو جائے گا۔ مولانا کا کہنا ہے کہ متوفیک کے بعد رافعک الیّ سے مزید یہ پہلو واضح ہوتا ہے کہ تمہاری موت کی صورت یہ ہے کہ میں تمہیں اپنی طرف اٹھالوں گا۔ تیسرا قرینہ یہ ہے کہ رافعک الیّ سے صرف رفع درجات کا مفہوم لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی وجہ صلہ الی بے ضرورت ہو کر رہ جائے گا اور کوئی لفظ صرف قرآن کریم میں غیر ضروری مستعمل نہیں ہوا ہے۔ اگر بلندیٔ درجات مقصود ہوتی تو الیّ نہ آتا جیساکہ قرآن کریم میں ارشاد ہے :

"منهم من كلم الله ورفع بعضهم درجات"(بقرہ : ۲۵۳)
(اور ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے بات کی اور بعض کے مدارج بلند کئے۔)

چوتھا قرینہ یہ ہے کہ قرآن نے جہاں دوسرے مقام پر یہ مضمون ذکر کیا ہے وہاں متوفیک کا لفظ بالکل اڑادیا ہے، قتل اور سولی کی نفی کرتے ہوئے صرف اٹھالینے کا ذکر کیا گیا ہے یعنی "بل رفعه الله اليه" اس سے توفی کی پوری صورتحال سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی جانب اٹھالیا ہے۔(۷)

"مهيمن" سے متعلق مولانا نے بڑی قیمتی بحث کی ہے۔اسے یہاں لفظ بہ لفظ نقل کیا جارہا ہے :

"مھیمن اصل میں مُاءِ مِنْ ہے دوسرا ہمزہ ی سے اور پہلا ہ سے بدل گیا ہے۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے (۲۳ : حشر)اور قرآن کی صفت کے طور پر بھی "هيمن الطائر على فراخه کے معنی یہ ہوگا کہ پرندہ اپنے بچوں کے اوپر پر پھیلائے ہوئے منڈلارہا ہے، گویا ان کو اپنی حفاظت میں لئے ہوئے ہے۔ هيمن فلان على كذا فلاں اس چیز کا محافظ اور نگراں بن گیا، اپنے سے سابق صحیفہ پر قرآن کے مہیمن ہونے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن اصل معتمد نسخہ کتاب الٰہی کا ہے۔ اس لئے وہ دوسرے صحیفوں کے حق اور باطل میں امتیاز کے لئے کسوٹی ہے۔جو بات اس کسوٹی پر کھری ثابت ہوگی وہ کھری ہے جو اس پر کھوٹی ثابت ہوگی وہ محرف ہے۔ یہاں الکتاب کا لفظ واحد استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن سے پہلے اصل شریعت کے اعتبار سے کتاب الٰہی کی حیثیت دراصل تورات ہی کو حاصل ہے۔بقیہ صحائف اس کے اجزاء وفروع کی حیثیت رکھتے ہیں۔"(۸)

"الجبار" بھی اللہ کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم زور آور اور تگڑے کے ہیں۔ عربی میں یہ لفظ کھجور کے ان درختوں کے لئے بھی آتا ہے جو غیر معمولی طور پر اونچے ہوں۔ قرآن میں ان زور آوروں کے لئے بھی آیا ہے جن سے ڈر کر بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی تھی کہ ان فیما قوما جبارین وانا لن ندخلھا حتی یخرجوا منھا (المائدہ : ۲۲)(اس بستی میں بڑے ہی زور آور اور تگڑے لوگ ہیں، جب تک وہ اس میں ہیں ہم اس میں داخل ہونے کا حوصلہ نہیں کر سکتے)(۹) یہ صفت ان تمام تصورات الوہیت کی نفی کرتی ہے جن میں ساری اہمیت دیویوں کو دی گئی ہے۔"

"ملکوت" بھی صفات الٰہی میں سے ایک صفت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ملکوت جس طرح رہبہ سے رہبوت ہے اسی طرح ملک سے ملکوت ہے۔ ملکوت کا لغوی مفہوم تو عزت واقتدار، بادشاہت اور سلطنت ہے، لیکن قرآن میں لفظ خدا کی اس تکوینی بادشاہی کے لئے استعمال ہوا ہے جو آسمان اور زمین بلکہ ہر چیز پر قائم ودائم ہے۔ اس ملکوت الٰہی پر غور کرنے کی دعوت مختلف اسلوبوں سے قرآن میں باری باری دی گئی ہے۔(۱۰)"اولم ینظروا فی ملکوت السموات والارض" (اعراف : ۱۸۵)(کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین میں خدا کی بادشاہی پر غور نہیں کیا۔"سبحان الذی بیدہ ملکوت کل شئی والیہ ترجعون" (یٰسین : ۲۳) (پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے)

صفات رسول ﷺ سے متعلقہ الفاظ :

قرآن میں آنحضور ﷺ کو مختلف ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ ان ناموں پر غور کیا جائے تو ان سے آپ کی مختلف حیثیتوں اور صفات کا پتہ چلتا ہے۔ قرآن کریم میں آپ کو مزمل، مدثر، نبی، رسول، امی، مذکر اور محمد وغیرہ جیسے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ نذیر، بشیر، مشیر، شاہد، داعی، اور سراج منیر وغیرہ سے یاد کیا گیا ہے۔(۱۱)

"مزمل" دراصل متزمل ہے جس کا مفہوم چادر لپیٹے رکھنے کے ہیں۔ یہ

صورتحال اس شخص پر طاری ہوتی ہے جو اپنے ماحول سے بد دل اور مایوس ہو چکا ہو، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے اس لفظ سے پکارا گیا ہے چونکہ آپؐ اپنی قوم کو آخرت کے عذاب سے ڈرا رہے تھے۔ لیکن اس نے آپؐ کی دعوت توحید پر کوئی توجہ نہ دی جس کی وجہ سے آپؐ حیران و پریشان تھے۔ چادر لپیٹ کر اپنی قوم سے منقطع ہو کر اپنے خلق حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ جاتے۔ بعض مفسرین نے چادر اوڑھنے سے آپؐ کی غفلت مراد لی ہے جبکہ یہ مناسب نہیں ہے کیونکہ آپؐ کی پوری حیات مبارکہ شاہد ہے کہ آپؐ ہمیشہ اپنی قوم کے سلسلے میں متفکر رہے۔ (۱۲)

"مدثر" کے باب میں صاحب تدبر کا خیال ہے کہ یہ مزمل کے ہم معنی ہے اور دثار سے ہے۔ دثار اس چادر کو کہتے ہیں جو سونے والا استعمال کرتا ہے۔ اصلاً یہ فکر مندی کی علامت ہے۔ ابتدائے بعثت میں آپ جن حالات سے دوچار ہوئے اس کی وجہ سے آپ کو شدید غم کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حالات میں انسان بالعموم چادر لپیٹ کر قدرے سکون پاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس تصویر کو دیکھ کر نہایت شفقت کے ساتھ فرمایا" یا ایھا المزمل "اور"یا ایھا المدثر" اس میں ایک طرح کی تسلی اور پیار شامل ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ خداوند قدوس آپ کی صورتحال سے غافل نہیں ہے۔ (۱۳)

سورہ احزاب کی آیت: ۴۵۔۴۶ میں آپ کی کئی صفات کی طرف اشارہ موجود ہے۔ ان اشارات سے آپ کی عظیم شخصیت کے بلند مقام و مرتبہ کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ سب سے پہلے آپ کو "شاہد" کہا گیا ہے "شاہد سے مراد ہے اللہ کے دین اور اس کے احکام و مرضیات کی گواہی دینے والا، رسول کی بعثت کا اصلی مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو یہ بتائے کہ اللہ نے کن باتوں کو حکم دیا ہے۔ کن باتوں سے روکا ہے۔

مبشر اور نذیر سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے پیغام کو قبول کر لیں ان کو آپ ابدی فوز و فلاح کی خوشخبری دیں اور جو لوگ اس سے اعراض یا اس کی تکذیب

کریں ان کو ان کے نتائج سے آگاہ کریں۔(۱۴)

اسی آیت میں آپؐ کو "داعیاً الی اللہ باذنہ" کہا گیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہ فریضہ سونپا ہے کہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں، نیز شیطان اور اس کے ساتھیوں سے دور رہنے کی تلقین کریں۔ اس آیت سے یہ بات بھی منظر عام پر آتی ہے کہ محمد ﷺ خود ساختہ نہیں ہیں۔ آگے اسی آیت میں آپؐ کی شخصیت کو "سراج منیر" سے تعبیر کیا گیا۔ یعنی آپؐ ایک روشن چراغ کے مانند ہیں، اسی روشنی کے ذریعہ صراط مستقیم تک رسائی ممکن ہے۔ اگر اس روشن چراغ کی قدرو منزلت کو نہ پہچانا گیا تو دنیا گمراہیوں کے حصار میں یہ زندگی گذارے گی اور اس کے بعد آخرت میں جہنم کی آگ ان کے استقبال کے لئے منتظر ہو گی۔(۱۵)

صفات قرآن کریم سے متعلقہ الفاظ :

قرآن کریم میں قرآن کے متعدد نام بتائے ہیں۔ ان ناموں سے قرآن کریم کی مختلف عظمتوں اور اس کی مختلف حیثیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کلام کس نوعیت کا ہے اور ہم لوگوں کا اس کے ساتھ کیا طرز عمل ہونا چاہئے۔ سب سے پہلے اسے "الکتاب" سے موسوم کیا گیا۔ "الکتاب" کے باب میں بحث کرتے ہوئے مولانا نے بتایا کہ یہ قرآن کریم میں پانچ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورہ انفال کی آیت نمبر ٦٨ میں توشۂ تقدیر کے معنی میں آیا ہے۔ سورہ 'ق' کی آیت نمبر ۴ میں ریکارڈ اور رجسٹر کے معنی میں ہے۔ سورہ نمل کی آیت نمبر ۲۹ میں خط اور پیغام کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ سورہ جمع کی آیت نمبر ۲ میں احکام اور قوانین کے معنی میں آیا ہے اور سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۲۲ میں آسمان اور الہامی مجموعہ کے معنی میں آیا ہے نیز کتاب سے اس مجموعہ کا کوئی خاص حصہ بھی مراد ہوتا ہے۔ لفظ کتاب کے متعلق مولانا کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مختلف معانی کے لئے ضرور آتا ہے لیکن اب ایک اعلی مفہوم کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔ یعنی الکتاب اب قرآن کریم کے لئے معروف ہے۔ قدیم زمانہ میں بھی انبیاء کے صحیفوں کو سفر یعنی کتاب کہا جاتا تھا۔ عیسائی مترجمین نے

ان صحیفوں کو بائبل کا نام دیا۔بائبل کے معنی بھی یونانی میں کتاب ہی کے ہوتے ہیں اسی طرح انھیں Scripture کہا گیا جس کا معنی بھی لاطینی میں کتاب ہی کے ہوتے ہیں۔ یعنی قدیم زمانہ سے کتاب کا لفظ کتاب اللہ کے لئے استعمال ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس لئے یہ لفظ قرآن کے لے کوئی نیا نہیں ہے۔بلکہ قرآن کریم نے اس لفظ کی وسعت اور جامعیت کو پورے طور سے قارئین کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔(۱۶)

قرآن کریم کی صفت کے لے ایک لفظ "هُدىٰ" آتا ہے۔ یہ لفظ چار معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جن کے نظائر قرآن کریم میں موجود ہیں۔ سورہ محمد کی آیت نمبر ۱۷ میں قلبی نور و بصیرت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ سورہ حج کی آیت نمبر ۶۸ میں سیدھا اور صاف راستہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہیں سے لفظ طریقہ کی اور شریعت کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ سورہ آل عمران میں ارشاد باری ہے " ان الهدى هدى الله" (آل عمران : ۷۳) اور بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۲ میں فعل ہدایت کے معنی میں آیا ہے۔ مذکورہ چاروں معانی کے اعتبار سے قرآن کریم کتاب ہدایت ہے۔(۱۷)

قرآن کریم کی ایک صفت "فرقان" بتائی گئی ہے۔ قرآن کریم نے تورات اور جنگ بدر کو بھی فرقان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ان کتابوں کو فرقان کیوں کہا گیا؟ مولانا لکھتے ہیں : "ان کتابوں کو فرقان کے لفظ سے تعبیر کرنے میں کئی پہلو مد نظر ہیں۔ ایک یہ کہ یہ تمام احکام و ہدایت کی تفصیل پیش کرتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ حق و باطل اور حرام و حلال کے درمیان امتیاز کرتی ہیں۔ تیسرا یہ کہ اپنے مقصد و مدعا میں بالکل واضح ہیں۔ چوتھا یہ کہ ان سے انسان کو وہ حکمت حاصل ہوتی ہے جو زندگی کے تمام نشیب و فراز میں خیر و شر کی شناخت کے لئے روشنی بخشتی ہے"(۱۸) ایک دوسری جگہ مولانا نے اس لفظ پر اس طرح روشنی ڈالی ہے قرآن کو فرقان کے لفظ سے تعبیر کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ یہ کتاب اپنے دعاوی اور اپنے پیش کرنے والے کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے بجائے خود دلیل و حجت ہے۔ یہ کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔بد قسمت ہیں وہ لوگ جو رسول کے ہاتھوں تقسیم

ہونے والی اس نعمت عظمیٰ سے متمتع ہونے کے بجائے اس سے ایسی چیزوں کا مطالبہ کریں جو ان کے لئے خیر کے بجائے تباہی کا باعث ہوں۔"(۱۹)

قرآن کی ایک صفت "تذکرہ" بتائی گئی۔ارشاد ربانی ہے :

"الا تذکرۃ لمن یخشیٰ"(طہٰ : ۳)

تذکرہ کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ یعنی قرآن کریم ان اسباق کو یاد دلانا چاہتا ہے جسے لوگ فراموش کر چکے ہیں۔ یعنی وہ ان کے سامنے کوئی نئی اور عجوبہ بات نہیں پیش کر رہا ہے وہ انہی حقائق سے بحث کرتا ہے جو ہمارے اندر موجود ہیں۔یاد دہانی کے لئے آفاق وانفس کے جن دلائل کو پیش کیا ہے وہ ہمارے اندر موجود ہیں۔اسی طرح عبرت و موعظت کے لئے جو تاریخی شواہد پیش کئے ہیں ان سے مخالفین بخوبی واقف تھے۔اور جن انبیاء کی تعلیمات کو بطور حوالہ پیش کیا ہے وہ ان کی ذریت اور پیرو ہونے کے مدعی تھے۔ان تمام پہلوؤں سے دیکھا جائے وہ قرآن کریم "تذکرہ" ہے۔(۲۰)

اسی طرح اسے ذکر اور ذکریٰ بھی کہا گیا ہے۔

سورہ نساء کی آیت نمبر ۷۴ میں قرآن کریم کو برہان اور نور مبین کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں : "برہان اور نور مبین سے مراد قرآن مجید ہے۔ برہان کے لفظ سے اس کے عقلی اور استدلالی پہلو کو واضح فرمایا ہے کہ وہ ایک حجت قاطع ہے۔اس کے اندر ہر شبہ ہر اعتراض اور ہر سوال کا مسکت اور تشفی بخش جواب موجود ہے۔بشرطیکہ آدمی اس پر کھلے دل سے غور کرے۔نور مبین سے اس کے عملی پہلو کو واضح فرمایا ہے کہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز میں حق و باطل کو واضح کر کے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتا ہے اور تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔"(۲۱)

قرآن کریم کی ایک صفت "مصدق" بھی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ تورات میں سرور کائنات ﷺ کی آمد اور خصوصیات کے متعلق جو پیشین گوئیاں کی گئی تھیں ان کی قرآن تصدیق کرتا ہے اس لئے نہایت سنجیدگی کے ساتھ قرآنی احکامات و

ہدایت کو دل سے قبول کر لینا چاہئے۔ کیونکہ یہ قرآن تمہاری کتاب کو سند تصدیق عطا کرتا ہے اور اسے آسمانی قرار دیتا ہے۔ ان کے انبیا کی نبوت اور تعلیمات کو تسلیم کرتا ہے اور ان میں جو کچھ تحریفات ہو چکی ہیں اس کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ (۲۲) اس حیثیت سے قرآن کریم کو مصدق ہونے کا حق حاصل ہے۔ (۲۳)

عبادات وروحانیات سے متعلق الفاظ :

اس زمرہ میں ایمان، صبر، تقویٰ، ہدایت، شکر، تسبیح، امانت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، معروف، منکر، عبادت، تزکیہ، ذکر، رشد، بر، خشوع، خضوع، احسان، صالحین، سمع و طاعت، توبہ، رکوع، سجود، صوم، اسلام، ولی اور ربانی وغیرہ جیسے الفاظ شامل ہیں۔ یہ چند الفاظ بطور مثال پیش کئے گئے ہیں ورنہ اس نوع کے بے شمار الفاظ قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں اور مولانا اصلاحی نے ان پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس بحث کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ مطالعہ قرآن کے شائقین جب لفظوں کے حقیقی معنی اور ان کی تہہ داریوں سے واقف ہو جاتے ہیں تو انھیں قرآن کریم کی فصاحت، بلاغت، اس کی حکمتوں اور رفعت کو سمجھنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے اور ان کے اندر قرآن فہمی کا ذوق پروان چڑھتا ہے۔

لفظ "صبر" پر مولانا اصلاحی نے بڑی جامع بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ لفظ صبر کے لغوی معنی نفس کو گھبراہٹ، مایوسی اور دل برداشتگی سے بچا کر موقف پر جمائے رکھنا ہے۔ قرآن مجید میں جب کہیں یہ لفظ آتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ اپنے رب کے عہد پر پوری توانائی کے ساتھ ڈٹا رہے اور مشکلات کے وقت اس کے پیروں پر ارتعاش نہ طاری ہو۔ عجز اور مسکنت صبر کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ قرآن کریم اور کلام عرب سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ (۲۴) مولانا فراہی نے اسی مفہوم کی طرف ان الفاظ میں رہنمائی کی ہے :

"لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عربوں کے نزدیک صبر عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو بے بسوں اور درماندوں کا شیوہ ہے بلکہ یہ عزم اور قوت کی بنیاد ہے۔

کلام عرب میں اس کا استعمال بہت ہے اور اس کے تمام استعمالات سے اسی مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔" (۲۵) اسی مفہوم کو حاتم طائی نے اس طرح پیش کیا ہے :

صبر نا له فی نہکہاو مصابها - باسیا فنا حتی بیوح سعیرها (۲۶)

(ہم نے ان کے تمام آفات و شدائد کے مقابل اپنی تلواروں کے ساتھ ثابت قدمی دکھلائی یہاں تک کہ وہ ٹھنڈے ہو گئے)

اصبح اپنے شعر میں صبر کا مفہوم اس طرح پیش کیا ہے :

یا ابن الجحاجحة المداره - والصابرین علی المکاره (۲۷)

(اے شریف سرداروں اور شدائد پر صبر کرنے والوں کی اولاد)

زہیر بن ابی سلمیٰ نے صبر کو اس طرح پیش کیا ہے :

قواد الجیاد اصهار الملوك وصبر - فی مواطن لو كانوا بها سئموا (۲۸)

(اصیل گھوڑوں کی سواری، بادشاہوں کی دامادی اور ایسے مورچوں میں ثابت قدمی جہاں دوسرے ہمت ہار بیٹھیں)

صبر کے مفہوم کی مزید وضاحت کے لئے سورہ بقرہ کی آیت "والصابرین فی البأساء والضراء وحین البأس" (البقرہ : ۱۷۷) پیش کرتے ہوئے اس میں صبر کے تین مرحلوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ غربت، بیماری اور جنگ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصائب و شدائد کے یہی تین سرچشمے ہیں۔ یہ صفت انسان اپنے اندر نماز کی مدد سے پیدا کر سکتا ہے۔ اور یہ رشتہ استوار ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے بڑی بڑی مشکلات و موانع سے گزار دیتا ہے۔ (۲۹)

قرآن کریم کی مشہور اصطلاح "خشوع" کے متعلق مولانا رقم طراز ہیں کہ اس کا اصل مفہوم پستی، فروتنی اور عجز و تذلل ہے۔ آواز اگر پست ہو تو اس کا مفہوم بھی یہ لفظ ادا کرے گا، نگاہ جھکی ہوئی ہو تو اس کے لئے بھی استعمال ہو گا اور اسی طرح اونٹ کا کوہان لاغری کے سبب بیٹھ جائے تو اس کے لئے بھی آئے گا۔

"وانها لکبیرة الاعلی الخاشعین" سے اوپر صبر اور نماز سے استقامت کی

تلقین کی گئی تھی۔ لیکن یہ راہ انھیں لوگوں کے لئے ممکن ہے جن کے اندر خشوع ہو، اور ہر وقت اپنے رب کے حضور جواب دہی کے احساس سے خائف رہنے والے ہوں۔ یہ راہ ان لوگوں کے لئے مشکل ہے جن کے دلوں میں کبر و غرور کی جڑیں گہرائی تک اتر چکی ہوں اور وہ اللہ اور آخرت کے تصور سے بالکل آزاد ہوں۔ جس طرح نماز صبر کے لئے معاون ہے اسی طرح خشوع نماز اور صبر دونوں کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے دل پر خشوع طاری ہو جائے وہ دنیا کی تمام طاقتوں کو ہیچ اور تمام موانع کو سہل ترین تصور کرنے لگتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ اگر نماز میں خشوع نہ ہو تو وہ کھوکھلی ہے۔

"قدافلح المومنون الذین هم فی صلوٰتهم خٰشعون۔" (مومنون :۱)

(ان مومنوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں تذلل اختیار کرتے ہیں۔"

قرآن کریم میں ایسے ہی مومنین کے متعلق یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے اور دوبارا اٹھنے پر پورا یقین رکھتے ہیں، چونکہ خاشعین کو روز آخرت کا پختہ یقین ہوتا ہے اسی لئے ہمہ آن ان کے دلوں پر خوف طاری رہتا ہے۔ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۹۰ میں خاشعین کی ایک صفت یہ دہرائی گئی ہے کہ امید و بیم دونوں حالتوں میں اپنے خالق و رازق کو پکارتے ہیں۔ خاشعین کی مزید وضاحت اس آیت سے ہوتی ہے(۳۰) :

"الذین یظنون انهم ملٰقوا ربهم انهم الیه راجعون" ۔(البقرہ : ۴۶)

(انھیں پختہ یقین ہے کہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور اسی کی طرف پلٹنے والے ہیں)۔

اس آیت کی روشنی میں مولانا فرماتے ہیں کہ "خاشعین کی تعریف میں یہ بات ان کے باطن پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے اوپر عجز و مسکنت اور پستی و فروتنی کی جو حالت طاری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں آخرت کا خوف اور خدا کے سامنے حاضری کا ڈر سمایا ہوا ہے"(۳۱)

مولانا نے "بَر" پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے مختلف مفاہیم کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ برّ کی پوری بحث یہاں نقل کی جاتی ہے :

"بَرّ" کا لفظ عربی زبان میں ایفائے عہد، وفاداری اور ادائے حقوق کے معنی میں آتا ہے، حقوق میں ہر قسم کے حقوق شامل ہیں۔ بنیادی اور حقیقی بھی، مثلاً خدا کی فرمانبرداری، والدین کی اطاعت اور خلق کے ساتھ ہمدردی، پھر آگے چل کر اس میں وہ حقوق بھی شامل ہو جاتے ہیں جو قول و قرار اور معاہدات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ لفظ احسان اور نیکی کی تمام قسموں پر حاوی ہے اور عدل کا بھی ہم معنی ہے۔ اپنے استعمالات کے لحاظ سے یہ لفظ اثم (حقوق تلفی) عقوق (والدین کی نافرمانی)، غدر (بے وفائی) اور ظلم کی ضد ہے۔ 'برّ' اور 'باراً' سے صفت کے صیغے میں استعمال ہیں۔ مثلاً کہیں گے برٌّ بوالدہ وہ اپنے باپ کا فرمانبردار ہے۔ برٌّ بالقسم کے معنی ہیں اس نے اپنی قسم پوری کی۔ قرآن مجید میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں وارد ہے "کان تقیا و برًّا بوالدہ ولم یکن جباراً عصیاً۔" (پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا فرمانبردار تھا، سرکش اور نافرمان نہ تھا) دوسری جگہ فرمایا : "لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون" (تم خدا کی فرمانبرداری کا حقیقی درجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو) اللہ تعالیٰ کی تعریف میں ہے "انہ ھو البر الرحیم" (بے شک وہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے والا اور مہربان ہے) نیز فرمایا ہے : "وتعاونوا علی البر و التقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (اور تعاون کرو ایفائے حقوق اور تقویٰ کے کاموں میں اور نہ تعاون کرو حق تلفی اور تعدی کے کاموں میں) اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بر کا لفظ ایک پہلو سے نیکی اور بھلائی کے تمام کاموں پر مشتمل ہے۔ لیکن اپنے خاص مفہوم کے لحاظ سے یہ حقوق اور فرائض کے ایفا کے لئے آتا ہے۔ (۳۲)

لفظ "ھدی" کے متعدد معانی ہیں جن کے نظائر قرآن کریم میں موجود ہیں۔ مولانا نے چار مثالیں قرآن کریم سے پیش کی ہیں :

۱۔ قلبی نور اور بصیرت :

مثلاً : "والذین اھتدوا زادھم ھدی" (محمد : ۱۷)(اور جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں، اللہ ان کی قلبی بصیرت میں اضافہ فرماتا ہے۔)

۲۔ دلیل حجت اور نشان راہ :

"او اجدعلی النارھدی"(طہٰ : ۱۰)(مجھے آگ کے پاس پہنچ کر کوئی نشان راہ مل جائے)"بغیرعلم ولاھدی ولا کتاب منیر" (حج : ۸)(بغیر کسی علم، بغیر کسی دلیل اور بغیر کسی روشن کتاب کے)

۳۔ سیدھا اور صاف راستہ :

مثلاً : "انك لعلی ھدی مستقیم" (حج : ٦٨) بے شک تم ایک سیدھے راستے پر ہو)، یہیں سے یہ لفظ طریقہ اور شریعت کے معنی میں استعمال ہوا۔ اس معنی کی قرآن میں مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً : "فبھدا ھم اقتدہ "(انعام : ۹۰)(پس ان کے طریقہ کی پیروی کرو)"ان الھدی ھدی اللّٰہ" (آل عمران : ۷۲)(اور شریعت تو بس اللہ کی شریعت ہے)

۴۔ فعل ہدایت :

مثلاً : لیس علیك ھداھم ولکن اللّٰہ یھدی من یشاء" (البقرہ : ۲۷۲)
(ذمہ اس کے ہدایت دینا نہیں ہے بلکہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے)

لفظ "متقی" کے بھی مولانا نے چار معانی آیات کریمہ کی روشنی میں بتائے ہیں۔

۱۔ یہ لفظ "اتقا" سے ہے :

جس سے نقصان پہنچے کا خطرہ ہو اس سے بچنا۔ مثلا "فکیف تتقون ان کفرتم یوما یجعل الولدان شیبا" (مزمل : ۱۷)(اگر تم نے کفر کیا تو اس دن سے کیسے بچ سکو گے جو بچوں کو بوڑھا کردے گا۔)

۲۔ کسی آفت کے ظہور سے اندیشہ ناک رہنا :

مثلا : " واتقوا فتنة لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصة" (انفال : ۲۵)

(اور اس آفت سے چوکنے رہو جو خاص طور پر انہی پر نہیں آئے گی جنھوں نے تم میں سے ظلم سے ارتکاب کیا ہوگا)

۳۔ اس رب قدوسی سے برابر لرزتے اور کانپتے رہنا جو اپنے شکر گذار اور وفادار بندوں پر رحم فرماتا ہے، جو کفر و معصیت کو ناپسند کرتا ہے اور جو ظاہر و پوشیدہ سے باخبر ہے۔" وسیق الذین اتقوا ربهم الیٰ الجنة زمرا" (زمر: ۷۳) (اور جو لوگ اپنے پروردگار سے برابر ڈرتے رہے، ان کو گروہ در گروہ جنت کی طرف لیجایا جائے گا)

۴۔ اس کا چوتھا مفہوم مذکورہ تینوں مفاہیم کا جامع ہے۔ یعنی گناہ سے اس کے برے نتائج اور خدا کے غضب کے ڈر سے بچتے رہنا، جب یہ لفظ مفعول کے بغیر استعمال ہوتا ہے تو عموماً یہی معنی مراد ہوتے ہیں۔ اور اسی چیز کو تقوی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "وان تومنوا و تتقوا فلکم اجرعظیم" (آل عمران: ۱۷۹) (اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہارے لئے بڑا اجر ہے)

مذکورہ تشریح سے جو مفہوم ابھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ دراصل متقی وہ شخص ہے جس کے دل میں خدا کی عظمت جاگزیں ہو، قہر الٰہی کا پورا پورا احساس ہو اور یہ یقین کامل ہو کہ گناہ کے نتائج سامنے آکر رہیں گے۔ (۳۳)

لفظ ایمان کے باب میں صاحب تدبر کی تحقیق یہ ہے کہ اس کی اصل امن ہے، جس کا مفہوم امن دینے کے ہیں اگر اس کا صیغہ 'ل' ہے تو اس کے معنی تصدیق کرنے اور اگر 'ب' کے ساتھ آئے تو اس کے معنی یقین و اعتماد کرنے کے ہو جاتے ہیں اس لفظ کی حقیقی روح یقین اور اعتماد ہے جو یقین، خشیت، توکل اور اعتقاد کی خصوصیات کے ساتھ پایا جائے اس کو ایمان کہتے ہیں، جو شخص اللہ تعالیٰ پر اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالہ کر کے اس کے فیصلوں پر راضی اور مطمئن ہو جائے وہ مومن ہے۔"(۳۴)

لفظ "احسان" کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ "احسن الی فلاں" کے

معنی ہوں گے فلاں کے ساتھ احسان کیااور احسن الشیئی کے معنی ہوں گے اس چیز کو بہت خوبی کے ساتھ کیا۔ اس وجہ سے محسن کا لفظ عربی میں احسان کرنے والے کے لئے بھی آتا ہے اور کسی عمل کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دینے والے کے لئے بھی۔ موقع کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں (سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۵۸) یہ لفظ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔(۳۵)" ایک دوسری جگہ احسان پر اس انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں :

"احسان عدل سے ایک زائد شی ہے۔ یہ صرف حق کی ادائیگی ہی کا تقاضہ نہیں کرتا، بلکہ مزید براں یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ دوسرے کے ساتھ ہمارا معاملہ کریمانہ اور فیاضانہ ہو۔(۳۶)

"تسبیح "کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ سامنے عجزو تذلل کے ساتھ بچھ جانا۔ تسبیح قول اور عمل دونوں سے ہوتی ہے۔ عمل کا مطلب یہ ہے کہ تمام کاموں میں اللہ کے حکموں کو تسلیم کیا جائے۔ تمام غیر ذی روح اشیاء بھی موجودات بھی اللہ کی تعریف کرتی ہیں قرآن کے مطابق نماز سر فگندگی کی سب سے جامع تصویر ہے۔ قولی تعریف تسبیح سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو ان چیزوں سے ہرگز نہ جوڑا جائے تو شان الوہیت کے خلاف ہیں۔ یعنی اس کی پاکی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ان صفات سے متصف کیا جائے جن کی بنیاد پر وہ لائق حمد و شکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تسبیح کے بعد اس کی تقدیس کا ذکر ہوا ہے۔(۳۷)

لفظ عبادت پر تدبر قرآن میں اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے "عبادت کے اصلی معنی عربی لغت میں انتہائی خضوع اور انتہائی عاجزی اور فروتنی کے اظہار کے ہیں۔ لیکن قرآن میں یہ لفظ اس خشوع و خضوع کے اظہار کے لئے خاص ہو گیا ہے جو بندہ اپنے خالق و مالک کے لئے ظاہر کرتا ہے۔ پھر اطاعت کا مفہوم بھی اس لفظ کے لوازم میں داخل ہو گیا ہے کیونکہ یہ بات بالبدایت غلط معلوم ہوتی ہے کہ انسان جس ذات کو اپنے انتہائی خشوع و خضوع کا واحد مستحق سمجھے زندگی کے معاملات میں اس کی اطاعت کو لازم

نہ جانے۔ چنانچہ عبادت کی اس حقیقت کو قرآن مجید نے بعض جگہ کھول بھی دیا ہے"(۳۸) قرآن کریم میں ارشاد ہے :"انا انزلنا الیك الکتاب بالحق فاعبداللّٰه مخلصاً له الدین" (زمر : ۲) ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے، حق کے ساتھ تواللہ ہی کی بندگی کرو اسی کے لئے اطاعت کو خاص کرتے ہو"

عبادت کے ساتھ اطاعت بھی لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں اطاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔"الا تعبدوا الشیطن۔ انه لکم عدو مبین" (یٰسین : ٦٠)(شیطان کی عبادت (اطاعت) نہ کرو کیونکہ وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے)

عبادت کے مفہوم و مدلول پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق بندوں پر ہیں۔ اللہ اپنے بندوں کے حقوق کو پورا کرتا ہے۔ وہ اس کی درخواست کو پوری کرتا ہے اس پر طرح طرح کی نعمتوں کا نزول کرتا ہے، اس لئے اس کا تقاضا ہے کہ اسی کو اپنا مرجع تصور کیا جائے اور تنہا اسی کی بندگی کی جائے۔(۳۹)

لفظ "زکوٰۃ" پر مولانا نے ان لفظوں میں روشنی ڈالی ہے "زکوۃ کا لفظ زکا یز کو سے ہے، جس کے معنی پاک ہونے کے ہیں۔ عربی میں نفس زکیہ اس نفس کو کہتے ہیں جو گناہوں سے پاک صاف ہو، دوسرا مفہوم اس مادے کے بڑھنے اور نشو و نما پانے کے ہیں۔ زکا الزرع کے معنی ہیں کھیتی بڑھی اور اپجی۔ زکوٰۃ کے اندر پاکیزگی اور نشو و نما دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ زکوٰۃ نفس اور حال دونوں کو پاکیزگی بھی بخشتی ہے اور اس سے مال میں برکت اور بڑھوتری بھی ہوتی ہے۔"(۴۰) قرآن مجید کی بعض آیات سے اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

"خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزکیهم بها" (توبہ : ۱۰۴)(ان کے مالوں کا صدقہ قبول کرلو، ان کو اس کے ذریعہ سے تم پاک کروگے۔ اور ان کا تزکیہ کروگے)

ابتدا میں زکوٰۃ کا مفہوم صدقہ کے مثل تھا لیکن بعد میں اس کی تخصیص کردی گئی یعنی اب اس سے مراد مال و دولت کا ایک متعین حصہ غرباء و فقراء میں تقسیم کرنے

کانام شرع میں زکوٰۃ ہے۔(۴۱)

"صلوٰۃ" کا لفظ اصل لغت میں کسی شئ کی طرف متوجہ ہونے کے لئے آیا ہے۔ پھر یہیں سے یہ لفظ رکوع کے معنی میں اور پھر تعظیم و تضرع کے اور دعا کے معنوں میں استعمال ہوا۔(۴۲) استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ عبادت کے معنی میں بہت قدیم ہے۔ کلدانی میں دعا اور تضرع کے معنی میں اور عبرانی میں رکوع اور نماز کے معنی میں یہ استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ایک اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے۔ جس کی وضاحت قرآن نے بھی کردی ہے اور سنت نے بھی اس کی پوری وضاحت کی ہے۔(۴۳)

لفظ صوم کی تحقیق کے سلسلے میں مولانا رقمطراز ہیں کہ "صوم اور صیام مصدر ہیں صوم کے لغوی معنی کسی شی سے رک جانے اور اس کو ترک کرنے کے ہیں۔ صام الفرس صوماً کے معنی ہیں گھوڑے نے چارہ نہیں کھایا(۴۴) نابغہ کا شعر ہے :

خیل صیام وخیل غیر صائمة

تحت اللجاج اخری تعلك اللجما (۴۵)

مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب "اصول الشرائع" میں لکھا ہے کہ عرب اپنے گھوڑوں کی جنگی تربیت کے لئے بھوکا پیاسا رکھتے تھے تاکہ میدان جنگ میں اس طرح کی سختیوں کو برداشت کرسکیں۔(۴۶) جریر نے اپنے ایک شعر میں اسی صورت حال کی عکاسی کی ہے

ظللنا بمستن الحرور كأننا

له فرس مستقبل الريح صائم (۴۷)

(ہم لو کی تھپیڑوں کی جگہ جمے رہے، گویا ہم ایک ایسے گھوڑے کے ساتھ کھڑے ہوں جو باد تند کا مقابلہ کررہا ہو اور روزے رکھے ہوئے ہو)

قرآن کریم میں بے شمار ایسے الفاظ ہیں جن کی لسانی، لغوی اور بلاغی معانی اور مفاہیم کے اندر پوشیدہ معارف و حکم تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ مولانا اصلاحی نے اس

پہلو سے اپنی تفسیر میں بڑی قیمتی بحث کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس تفسیر نے مفردات کی تصریح و تشریح میں بڑی وقیع خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں پر چند الفاظ بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں جن پر مولانا نے بڑے عالمانہ و ناقدانہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً حکمت، آلاء، ساعت، یسر، زوج، غفران، دین، ہدایت، ایقان، عہد، شفاعت، آل، یہود، نصاریٰ، صائب، میثاق، منسک، امت وسط، استعانت، شعائر، تسخیر، تصریف، عکف، اطمینان، رباء، اعراف، فتنہ، درس، قطع، تمنی، غثا، مشکوٰۃ، خوض، ظن، المام، تیسیر، مجادلہ، صغو، مفتون، کشف ساق، غسلین، ناشئہ، ثیاب، معاذ بد، نازعات، تنفس، ضنین، غثاء احویٰ، عصر، حق، تبت یدا، تنزیل، ضرب علی الاذان، حق، محکمات، متشابہات، عبرت، تزئین، قسط، مسیح، حواری، انصار، حکم، حبل، سنن، ارادہ کے دو مفہوم، نشوز، تاویل، حذر، ظن، بحہ، اعتصام اور اسرائیل وغیرہ۔

''حکمت'' کے سلسلے میں مولانا اصلاحی نے مولانا فراہیؒ کی کتاب ''مفردات القرآن'' (۴۸) کا حوالہ دیا ہے۔ جس میں مولانا فراہیؒ نے اس لفظ پر بڑی وقیع بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ حکمت قرآن کے عنوان سے ان کی ایک مکمل کتاب بھی ہے۔ جس میں انھوں نے حکمت کے تمام پہلوؤں اور گوشوں پر بڑی جامع بحث کی ہے۔ اصل کتاب ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے البتہ ادارہ تدبر قرآن وحدیث، لاہور سے اور دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سے اس کا اردو قالب شائع ہو چکا ہے۔ (۴۹) اگرچہ ترجمہ اصل کی جگہ تو نہیں لے سکتا لیکن اس کے ذریعہ مولانا فراہیؒ کے تصور حکمت کو سمجھنے کی راہ ضرور ہموار ہوتی ہے۔ (۵۰)

لفظ حکمت کے مفہوم کی وضاحت کے لئے مولانا اصلاحی نے حکمت القرآن سے ایک اقتباس پیش کیا ہے ''رہی حکمت تو وہ تعبیر ہے اس قوت وصلاحیت کی جس سے انسان معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرتا ہے، حضرت داؤد کی تعریف میں ارشاد ہوا ہے ''واتیناہ الحکمۃ وفصل الخطاب'' (ہم نے اس کو حکمت عطا کی اور فیصلہ

معاملات کی صلاحیت) یہاں فصل الخطاب کے لفظ سے اس اثر کو بیان کیا ہے جو حکمت کا ثمرہ ہے۔ جس طرح فیصلہ معاملات کی صلاحیت کے ثمرات میں سے ہے اسی طرح اخلاق کی پاکیزگی اور تہذیب بھی اس کے ثمرات میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اہل عرب حکمت کا لفظ انسان کی اس قوت و صلاحیت کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں جو عقل و رائے کی پختگی اور شرافت اخلاق کی جامع ہوتی ہے۔ چنانچہ دانش مند اور مہذب آدمی کو حکیم کہا جاتا ہے اور جو بات عقل و دل دونوں کے نزدیک بالکل واضح ہو اس کو حکمت سے تعبیر کرتے ہیں۔"(۵۱)

حکمت کے سلسلے میں مولانا کی تحقیق یہ ہے "حکمت کا ذکر یہاں کتاب کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تعلیم حکمت تعلیم کتاب سے ایک زائد شئ ہے۔ اگرچہ یہ حکمت سر تا سر قرآن حکیم ہی سے ماخوذ و مستنبط ہو اس وجہ سے ہمارے نزدیک جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں ان کی بات میں بڑا وزن ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ حکمت چونکہ حکیمانہ بات کو بھی کہتے ہیں اور حکیمانہ بات کہنے کی صلاحیت کو بھی۔ اس لئے تعلیم حکمت کے معنی جس طرح کسی کو حکیمانہ بات بتا دینے کے ہیں اسی طرح اس کے معنی لوگوں کے اندر حکمت کی صفت و صلاحیت پیدا کرنے کے بھی ہیں۔(۵۲)

لفظ "آلاء" کا مفہوم بالعموم مفسرین نعمت بتاتے ہیں۔ جس کسی وجہ سے اس کی وسعت محدود ہو جاتی ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں اس کی جامعیت پر بڑی پر مغز بحث کی ہے۔ مولانا فراہی کی تحقیقات کو مولانا بدر الدین اصلاحیؒ نے بڑی خوبصورتی سے اپنے ایک مضمون میں پیش کیا ہے(۵۳) اس لفظ پر بحث کرتے ہوئے مولانا اصلاحی لکھتے ہیں کہ یہ اَلِیٌ اِلیٌ اَلیٌ کی جمع ہے اور مولانا فراہیؒ کے نزدیک یہ صرف نعمت کے معنی میں نہیں آتا بلکہ اس کے مفہوم میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ مولانا فراہی کی تحقیق ملاحظہ ہو: "ہر چند لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ آلاء کے لغوی معنی نعمتوں کے ہیں لیکن قرآن اور کلام عرب سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

کلام عرب تتبع اور لفظ کے مواقع استعمال سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ تو یہ ہے کہ اس کے اصل معنی کارناموں، کرشموں، اور عجائب قدرت و حکمت کے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کرشموں اور اس کی نشانیوں کا غالب حصہ ایک رحمت پر مشتمل ہے۔ اس وجہ سے لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ ان آلاء کے معنی نعمت ہی کے ہیں۔ (۵۴)

مولانا فراہیؒ نے اپنی بات کو باوزن بنانے کے لئے طرفہ، میہ بنت ضرار، مہلیل، ربیعہ بن مقروم، اجدع الہمدانی، فضالہ بن زید، خنساء اور بعض حماسی شعراء کے کلام سے استشہاد کرتے ہوئے بتایا کہ "آلاء" کے اندر نعمت، قدرت، شان، نشانی، کرشمہ، کارنامہ، اعجوبہ اور اس نوع کے تمام مفاہیم موجود ہیں۔ (۵۵) اس سلسلے کے دو شعر نقل کئے جا رہے ہیں:

کامل یحمل آلاء الفتی نبه سید سادات خضم (۵۶) (طرفہ)

(وہ شجاعت میں کامل ہے، نوجوان کی تمام خوبیاں اس کے اندر موجود ہیں، شریعت ہے سرداروں کا سردار ہے، اور فیاض قائد ہے۔

فبکی اخاك لالائه اذا المجد ضیعه السائسونا (۵۷) (خنسا)

(اسے اس کے بھائی کے کارناموں پر رلایا گیا، جس وقت ارباب حکومت نے ؛اس کے مجد د شرافت کو ضائع کر دیا)

لفظ "دین" قرآن کریم میں مختلف جگہوں پر آیا ہے اور وہ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے، سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۸۳ میں مذہب و شریعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یوسف کی آیت نمبر ۷۶ میں ملکی قانون کے لئے آیا ہے۔ سورہ نحل کی آیت ۵۲ میں اطاعت کے معنی میں ہے اور ذاریات کی آیت نمبر ۶ میں جزاء کا مفہوم ہے۔ جزاء سے جزاء خیر اور جزاء شر دونوں مراد لئے جاتے ہیں۔ (۵۸)

"شعائر" پر مولانا نے بڑی جامع بحث کی ہے۔ شعائر شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی اور اس کا مظہر اور نشان (Symbol) ہو، اصطلاح دین میں اس سے مراد شریعت کے وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور اور

اس کے رسول کی طرف سے کسی معنوی حقیقت کا شعور پیدا کرنے کے لئے بطور ایک نشان اور علامت کے مقرر کئے گئے ہوں۔ ان مظاہر میں مقصود بالذات تو وہ حقائق ہوا کرتے ہیں جو ان کے اندر مضمر ہوتے ہیں لیکن یہ مقرر کئے ہوئے اللہ اور رسول کے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان حقائق کے تعلق سے یہ مظاہر بھی تقدیس کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں" (۵۹) مثلاً قربانی حقیقت اسلام کا ایک مظہر ہے۔ اسی طرح حجر اسود ایک شعیرہ ہے، جمرات بھی شعائر اللہ میں سے ہیں۔ نیز بیت اللہ تو سب سے عظیم شعیرہ ہے اور صفا و مروہ کا شمار بھی شعیرہ کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ آگے مولانا نے شعائر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ اللہ کے مقرر کردہ ہیں ان کی تعظیم، تقدیس کے حدود متعین ہیں اور یہ شعائر محض قالب کے مانند ہیں۔ اصل حقائق تو وہ ہیں جو ان کے اندر مضمر ہیں اسی میں مولانا نے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ یہود نے شعائر میں بہت سی تحریف کر ڈالی تھیں۔ (۶۰)

"دابہ" کا معروف استعمال تو زمین پر چلنے پھرنے والے جانوروں کے لئے ہی ہے بلکہ زیادہ نمایاں طور پر ان جانوروں کے لئے جو سواری یا بار برداری کے کام آتے ہیں۔ لیکن یہ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے جس معنی میں ہم "جاندار" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے پہلے معنی کے لحاظ سے پرندے اس کے مفہوم سے خارج ہیں۔ صرف زمین پر چلنے پھرنے یا رینگنے والے جانور ہی اس سے مراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے بعض مقامات پر ندوں کو اس لفظ کے مفہوم سے الگ رکھا ہے۔ (۶۱) مثلاً ارشاد باری ہے: " ومامن دابة فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیه" (انعام: ۳۸) (اور نہیں ہے زمین پر چلنے والا کوئی جانور اور نہ اپنے بازوں سے اڑنے والا کوئی پرندہ) لیکن جب یہ اپنے دوسرے وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے تحت سارے ہی جاندار آجاتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ چرند ہیں یا پرند بلکہ اس صورت میں یہ بنی نوع انسان کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے" مولانا نے اس کے لئے بطور دلیل کے سورہ فاطر کی ۴۵، سورہ عنکبوت کی ۶۰ اور سورہ ہود کی ۶ آیات پیش کی ہیں۔ یہاں پر اول الذکر

آیت ملاحظہ کریں:

"ولو یواخذ اللہ الناس بما کسبوا ماترك علی ظهرها من دابة" (فاطر: ۴۵)

(اور اگر اللہ لوگوں کو ان کی بد اعمالیوں پر فوراً سزا دینے والا ہوتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی جیتا نہ چھوڑتا)

مذکورہ آیت میں دابہ تمام جانداروں چرند، پرند اور انسانوں کے لئے آیا ہے۔

"تصریف ریاح" کا ذکر قرآن میں مختلف انداز سے آیا ہے۔ اس کی وضاحت میں مولانا کے اشہب قلم کی جولانیاں اپنے عروج پر ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

"تصریف ریاح سے مراد ہواؤں کی گردش ہے۔ ان کی اس گردش کے مختلف پہلو خود قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ کبھی یہ اپنے کندھوں پر پانی سے بوجھل بادلوں کو لاد کر لاتی ہے اور زمین کو جل تھل کر دیتی ہے، کبھی یہ انہی بادلوں کو اس طرح اڑا کر لے جاتی ہے کہ کہیں اس کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ ایک قوم کے لئے یہ عذاب بن کر نمودار ہوتی ہیں دوسری قوم کے لئے رحمت بن کر۔ انہی کی گردش سے فرعون اور اس کی قوم غرق دریا ہوئی اور انہی کے تصرف نے موسیٰؑ اور ان کی قوم کو دریا سے پار کرایا۔ پھر یہ کبھی مرطوب بن کر فصلوں کو نشو نما دیتی ہیں۔ ان کو اگاتی اور پروان چڑھاتی ہیں کبھی گرم اور خشک ہو کر ان کو پکاتی اور تیار کرتی ہیں، کبھی یہ خزاں بن کر پتوں کو مرجھاتی اور چمن کو اجاڑتی ہیں کبھی بہار بن کر ایک ایک ٹہنی اور ایک ایک شاخ کو پھولوں اور کلیوں سے لاد دیتی ہیں۔ ان کے بھیس مختلف ہیں اور ہر بھیس میں نئی آن اور شان ہے اور جو شان بھی ہے وہ ان کے مصرف (اللہ) کی حکمت و قدرت اور اس کی رحمت و ربوبیت کا ایک عظیم نشان ہے۔" (۶۲)

"اسباب" سبب کی جمع ہے جس کے اصل معنی رسی کے ہیں۔ پھر یہیں سے اس کے اندر تعلق و توسل اور اسباب و وسائل کا مفہوم پیدا ہوا اور پھر مزید وسعت پا کر کسی شی کے متعلقات و اطراف کے لئے بھی اس کا استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ قرآن

میں اسباب السماء کی ترکیب استعمال ہوئی ہے "وتقطعت بھم السباب" میں جو "ھم" کی ضمیر ہے وہ "الذین اتبعوا" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین نے جن لوگوں کو شریک و شفیع سمجھ کر ان کے ساتھ تعلقات محبت و ارادت قائم کر رکھے ہیں ایک دن ان کے ان تعلقات کے تمام تار و پود بکھر جائیں گے اور یہ ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجیں گے۔" (۶۳)

تخبط کا لفظ خبط اللیل سے ہے جس کے معنی رات کی تاریکی میں بھٹکنے کے ہیں۔ خابط اللیل اس شخص کو کہیں گے جسے داہنے بائیں کچھ ہوش نہ ہو، بس یونہی ہرزہ گردی کر رہا ہو۔ اسی سے خبط عشوا کا محاورہ ان لوگوں کے لئے پیدا ہوا جو بصیرت سے بالکل محروم ہوں۔ اور اندھے بھیلسے کی طرح ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے ہوں اسی سے 'تخطبه الشیطان' نکلا جس کے معنی ہیں 'مسه الشیطان بخبل او جنون' اس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل اور دیوانہ بنادیا" (۶۴)

حبل کے معنی رسی کے ہیں۔ یہیں سے ترقی کر کے محبت و تعلق کے مفہوم میں بولا جانے لگا۔ ربیعہ بن مقروم کا شعر ہے :

ولکن وصلت الحبل منه مواصلة بحبل ابی بیان (۶۵)

(لیکن میں نے اس سے اپنا تعلق جوڑے رکھا ابو بیان کے تعلق سے وابستگی کی بنا پر)

یہیں سے یہ معاہدہ کے معنی میں استعمال ہوا۔ جس طرح رسی جوڑنے کا کام کرتی ہے اسی طرح معاہدہ دونوں قوموں کو جوڑتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے : "الا بحبل من الله وحبل من الناس" (مگر اللہ اور لوگوں کے کسی معاہدے کے تحت) سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ میں حبل سے مراد قرآن کریم ہے۔ کیونکہ یہ ایک رسی کے مانند ہے جو بندے کو اس کے اللہ سے جوڑتا ہے۔ ابو سعید خدری کی ایک روایت میں کتاب اللہ کو حبل اللہ کہا گیا ہے۔ جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے۔ (۶۶)

"لفظ اسرائیل" کے باب میں مولانا فرماتے ہیں "اسرائیل حضرت یعقوب

علیہ السلام کا لقب ہے۔ یہودی علماء اس کے معنی بطل اللہ کے بتاتے ہیں۔ معنی لینے میں غالباً اس روایت کو بڑا دخل ہو گا جو یہود نے تورات میں حضرت یعقوب کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کشتی لڑنے کی داخل کر رکھی ہے۔(٦٧)

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے ان کی تحقیق میں یہ لفظ دو جزوں سے مرکب ہے۔ اسرا ءایل۔ اسرا کے معنی ان کی تحقیق میں بندہ کے ہیں اور ایل عبرانی میں الہ کے معنی کے لیے مشہور ہے۔ اسی طرح مولانا کے نزدیک سرائیل کے معنی عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ کے ہوئے۔(٦٨)

اعراف کا مفہوم مولانا نے اس طرح واضح کیا ہے "اعراف، عرف کی جمع ہے ، عرف گھوڑے کی پیشانی کی چوٹی اور مرغ کی کلغی کو کہتے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ کسی مینارہ یا برجی یا دیدبان کے لئے استعمال ہوا، جو کسی اونچی دیوار یا پہاڑی پر بنادیا جائے جہاں سے تمام اطراف دجوانب کا مشاہدہ ہو سکے۔ قرآن کے اسلوب بیان سے واضح ہے کہ جنت و دوزخ کے درمیان جو دیوار کھڑی کی جائیگی یہ اعراف یعنی مینارے اور برجیاں اسی دیوار پر ہوں گے جہاں سے جنت و دوزخ کے تمام مناظر کا مشاہدہ ہو سکے گا۔(٦٩)

سورہ حج کی آیت نمبر ۸۷ میں سبعاًمن المثانی آیا ہے یہاں سات مثانی سے کیا مراد ہے اس سلسلے میں متعدد اقوال پائے جاتے ہیں مولانا نے تین اقوال نقل کئے ایک یہ کہ اس سے قرآن کی سات سورتیں مراد ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے سورہ فاتحہ مراد ہے جس میں بسم اللہ سمیت سات آیات آتی ہیں اور یہ نمازوں میں باربار دہرائی جاتی ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے پور قرآن ،مراد ہے مولانا نے اس تیسرے قول کو اپنے نزدیک رائج قرار دیا ہے۔ دلیل کے طور پر سورہ زمر کی آیت پیش کی ہے۔

" اللّٰہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابھا مثانی (زمر : ۲۳)(اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے ،ایک متشابہ مثانی کتاب کی صورت میں)

متشابہ سے مولانا یہ بتاتے ہیں کہ قرآن کی تمام آیات میں موزونیت اور ہم

آہنگی ہے، اس میں کہیں تناقص اور تضاد نہیں ہے، رہا مثانی تو اس پر مولانا نے مقدمہ تفسیر میں روشنی ڈالی ہے۔ یعنی یہ کہ تمام سورتیں جوڑا جوڑا ہیں۔ ہر سورت اپنا ایک ثنی رکھتی ہے۔ مثلاً بقرہ اور آل عمران اور اسی طرح معوذتین۔ مولانا کے نزدیک سبع من المثانی سے قرآن کریم کی سورتوں کے سات گروپ مراد ہیں۔ یعنی قرآن سات ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کے اندر سورتوں کی حیثیت فصلوں کی ہے۔ ان ابواب کی فصلوں کے مضامین میں اشتراک بھی ہے اور ان کا اپنا ایک امتیازی رنگ بھی۔ (۷۰)

"غثاءً احوی" کا ترجمہ مفسرین نے بالعموم کالا کوڑا یا خس و خاشاک کے لئے ہیں۔ غثاء کے معنی جھاگ یا خس و خاشاک کے ہوتے ھی ہیں لیکن غثاء احوی کے ساتھ آئے تو اس کا مفہوم ہوگا ایسی سیاہی جو کسی چیز پر شادابی، زرخیزی اور جوش نمو سے طاری ہوتی ہے۔ یہ عام طور مقامات اور باغوں کی صفت کے طور پر آتا ہے جس سے زبردست شادابی اور اس کے گھنے پن کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہیں سے صحت مند گل تر کی صورت کھلے ہوئے جوان کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔ (۷۱) جاہلی شاعر 'تابط شرا' اپنے ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے :

مسل فی الحی احوی رفل　　　و اذا یغزوا فسمح ازل (۷۲)

(یوں قبیلہ کے اندر تو وہ ایک خوش پوش سرخ و سپید بانکا تیار رہتا ہے لیکن جب میدان جنگ میں اترتا ہے تو شیر نیستاں بن جاتا ہے)

مولانا فراہی کا خیال ہے کہ غثاء کے معنی مکھن کے جھاگ اور سیلاب کے خس و خاشاک کے لئے آتا ہے۔ لیکن مقامات کی اس شادابی کے لئے بھی معروف ہے جو زمین کی زرخیزی کی وجہ سے سیاسی مائل ہو گیا ہو۔ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب "مفردات القرآن" میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور دلیل میں تین اشعار پیش کئے ہیں۔ (۷۳) یہاں پر صرف ایک شعر پر اکتفا کیا جائے گا۔

حلو ابا خضر قدمالت سرارته

من ذی غثاء علی الاعراض انضاد

(وہ ایک سر سبز و شاداب وادی میں اترے، جس کے بیچ گھنے اور شاداب سبزے اس کے کناروں پر باہم دگر گتھم گتھا اور ایک دوسرے پر تہ بتہ گرے ہوئے تھے۔)

مولانا اصلاحیؒ کا کہنا ہے کہ اس آیت کے بعد جو بحث آرہی ہے اس سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ اس 'غثاء احوی' سے مراد پودے کی سیاہی مائل سرخی اور شادابی کے لئے آتا ہے نہ کہ پودے کی کہنگی اور بوسیدگی کے لئے اور کلام عرب میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔(۷۴)

''تبت یداہ'' کا مفہوم ہلاک ہون اور خسارہ میں پڑنے کے ہیں اسی سے 'تبت ید افلاں' کا محاورہ نکلا ہے۔ جس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ فلاں کو دونوں ہاتھ یا تو حصول مقصد میں ناکام وعاجز رہے، دونوں ہاتھوں کی ناکامی اور کامل بے بسی کی تعبیر ہے۔ اگر کہیں کہ تبت یداہ تو اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ مقابلہ کرنے سے بالکل عاجز ہو گیا۔ اسی طرح ''کسر ید'' (ہاتھ توڑ دینا) کسی کا زور توڑ دینے کی تعبیر ہے۔(۷۵) فند الزمانی کا شعر ہے:

وترکنا دیار تغلب قفرا   وکسرنا من الغواۃ الجناحا(۷٦)

(ہم نے تغلب کے علاقہ کو چٹیل بنا کے چھوڑ دیا اور ان کے سرکشوں کے بازو توڑ دیے)

مذکورہ بحث سے یہ چیز منظر عام پر آئی کہ اس لفظ کے اندر ہجو و مذمت کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ یہاں پر یہ بتانا مقصود ہے کہ بہت جلد ابو لہب کے اوپر ہلاکت و تباہی کا نزول ہونے والا ہے۔ نیز اس کے زوال کی طرف ایک اشارہ ہے۔ مولانا فراہیؒ کا خیال ہے کہ 'مکسور الید' (شکستہ دست) سے مراد وہ شخص ہے جو مقابلہ سے عاجز ہو اور اپنے تلوار اٹھانے کی تاب نہ پا رہا ہو اس لئے یہاں کسی طرح مذمت کا پہلو نہیں نکلتا ہے بلکہ ابو لہب کا ذکر کنیت کے ساتھ کیا گیا ہے، جس سے عزت واحترام کا پہلو منظر عام پر آتا ہے۔(۷۷)

اس مقالہ کے آخر میں کچھ ایسے الفاظ زیر بحث آئیں گے جو کفر و شرک، فسق و فجور، ظلم و عداوت اور عصیان و استکبار کے ضمن میں آتے ہیں۔ مثلاً ظلم، ھوی یھوی، طغیان، طاغوت، کفر، شرک، استکبار، نفاق، باطل، شیطان، فسق، زیغ، ضلالت، صغو، غرور، فجور، ختم، مرض، فساد، رجس، غل، قہر، جہل، فحش، سفہاء، عدوان، جبت، حلاف اور مکر وغیرہ۔ مولانا نے مذکورہ الفاظ کے علاوہ اس قبیل کے بے شمار لفظوں پر بڑی مفید بحث کی ہے۔ لیکن یہاں صفحات کی تحدید کی بناء پر مذکورہ الفاظ میں سے چند ہی کو موضوع بحث بنانا ممکن ہو سکے گا۔

کفر کے باب میں مولانا رقمطراز ہیں "کفر کے معنی اصل لغت میں ڈھانکنے اور چھپانے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ شکر کی ضد کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے اور ایمان ضد کی حیثیت سے بھی، پہلی صورت میں اس کے معنی ناشکری اور کفران نعمت کے ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں انکار کے۔ غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ لفظ کی اصل روح ان دونوں معنوں کے اندر موجود ہے۔" (۷۸)

ختم کا مفہوم عربی زبان میں موم، یا مٹی یا کسی اسی طرح کی چیز پر ٹھپہ لگانے کے ہیں یہیں سے یہ لفظ خط پر مہر لگانے اور کسی چیز کے منھ کو اس طرح بند کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا جس کے بعد اس میں کوئی چیز داخل ہو سکے اور نہ کوئی چیز اس سے نکل سکے۔ ختم اللہ علی قلوبھم کا مفہوم یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے (اپنی سنت کے مطابق) ان کے دلوں پر مہر ثبت کر دی ہے۔ (۷۹)

"لفظ شیطان شاط یشیط سے ہے، یہ فعلان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی جلد باز، تند خو، مشتعل مزاج اور شریر و سرکش کے آتے ہیں۔ ان خصوصیات کے حامل جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی (۸۰) ۔

'فسق' کے اصل معنی خروج کے ہیں۔ یہاں سے یہ لفظ معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے لئے استعمال ہوا۔ قرآن مجید میں ابلیس کے متعلق ہے "کان من الجن فسق عن امر ربہ' (کھف: ۵۰) (وہ جنات میں

سے تھا پس اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی)

معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے مختلف مدارج ہو سکتے ہیں۔ منکر جھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور بڑا بھی۔ اسی طرح نافرمانی معمولی درجہ کی بھی ہو سکتی ہے اور بغاوت کے درجہ کی بھی۔ چنانچہ قرآن میں یہ لفظ عام منکرات سے لے کر کفر و بغاوت تک سب کے لئے استعمال ہوا ہے۔ بلکہ زیادہ تر اس کا استعمال ان بڑی نافرمانیوں ہی کے لئے ہوا ہے جن کے ساتھ ایمان جمع نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے قرآن میں اس لفظ کو اس ہلکے معنی میں ہر جگہ نہیں لینا چاہئے۔ جس معنی میں اس کو عام طور پر ہمارے فقہاء اور متکلمین نے لیا ہے۔"(۸۱)

فساد فی الارض ایک قرآنی اصطلاح ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس دنیا میں اللہ کے حکموں اور قوانین سے سر تابی کی جائے، دنیا کے نظام کو اپنی خواہشات کے مطابق چلایا جائے، اصلی حکمراں کی مرضیات کو نظر انداز کر دیا جائے 'فساد فی الارض' کے نتیجہ میں لوگوں کی جان، آبرو اور املاک کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں ہو گی۔ یہ تمام چیزیں اللہ کے عدل کے ساتھ بر قرار رہتی ہیں۔ دین الٰہی ہی صرف پورے کرۃ الارض پر قانون تحفظ قائم کر سکتا ہے۔ اگر دین اسلام کی اطاعت سے انحراف ہو تو یہ زمین فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن جائے گی۔(۸۲)

"طاغوت بروزن ملکوت و جبروت، طغی کے مادہ سے ہے۔ جس کے معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں، جو چیز اپنی حد مناسب سے آگے بڑھ جائے اس کے لئے عربی میں کہیں گے "وطغی طغی الماء" پانی حد سے آگ بڑھ گیا۔ قوم ثمود جس آفت سے ہلاک ہوئی۔ اس کے لئے طاغیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی آفت کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ حدود عبدیت و بندگی سے نکل جانے کے لئے استعمال ہوا۔ اور جو حدود بندگی سے نکل جائے اس کو طاغوت کہنے لگے۔ پھر وسعت اختیار کر کے یہ لفظ ان چیزوں پر بھی حاوی ہو گیا جو حدود بندگی سے نکل جانے کا باعث یا ذریعہ بنیں۔ اہل لغت اس وجہ سے اس کی تشریح یوں کرتے ہیں "الطاغوت عبارۃ عن

کل معتد و کل معبود من دون اللّٰہ" (طاغوت سے مراد ہر وہ وجود ہے جو بندگی سے نکل جائے اور ہر وہ معبود ہے جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے"(۸۳)۔

"غل یغل غلو کے معنی خیانت، بد عہدی اور بے وفائی کرنے کے ہیں یہ لفظ دراصل لفظ نصح کا ضد ہے۔ جس کے معنی خیر خواہی اور خیر سگالی کے ہیں اصحاب لغت میں سے زجاج نے "ماکان لنبی ان یغل' کی تشریح جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے 'ماکان لنبی ان یخون امنه' کے الفاظ کی ہے، لفظ غل جو قرآن مجید میں متعدد جگہ استعمال ہوا ہے۔ غش' عداوت، ضغن (کینہ) حقد اور حسد کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (لاتجعل فی قلوبنا غلاً للذین آمنوا) اس لفظ کو صرف مالی خیانت کے ساتھ مخصوص کرنے کی دلیل میرے علم میں نہیں ہے۔"(۸۴)

تفسیر تدبر قرآن کی نو جلدوں میں مولانا نے نہایت قابل قدر لغوی بحث کی ہے۔ ظاہر ہے اس کے لئے مولانا کو بڑی صعوبتوں اور موانع کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ مولانا کی تفسیر کا یہ پہلو تفاسیر آیات کے لئے حد درجہ ممد و معاون ہے۔ ان کی یہ خصوصیت انھیں دیگر مفسرین سے ممتاز و منفرد بنا دیتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر قرآنی الفاظ پر گہری گرفت نہ ہو تو تفسیر کا پورا پورا حق ادا نہ ہوگا۔ مفردات سے متعلق مولانا کی بحثیں اس قدر قیمتی ہیں کہ اگر انھیں الگ سے کتابی صورت میں یکجا کر دیا جائے تو یہ چیز مطالعات قرآن کے باب میں بہت مفید ثابت ہوگی۔

حواشی

۱۔ اسماء حسنی کے لئے دیکھئے، اسماء حسنیٰ، مشتاق احمد تجاروی، نقوش (قرآن نمبر) لاہور،، ۲/ ۴۹۸-۴۴۸

۲۔ مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، انجمن خدام القرآن، لاہور، طبع سوم اگست ۱۹۷۶ء، ۱/ ۶

۳۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، بار اول، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ۲/ ۵۰

۴۔ ایضاً، ۲/ ۵۱-۵۲

۵۔ تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی، بار اول، دار الشاعت اسلامیہ، لاہور، ۱/ ۶۵۷-۶۵۹

۶۔ ایضاً، ۱/ ۷۰۵

۷۔ ایضاً، ۱/ ۷۰۵-۷۰۶

۸۔ تدبر قرآن، ۲/ ۵۳۳

۹۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، بار اول، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ۸/ ۳۱۴

۱۰۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی بار اول، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ۳/ ۳۱۴

۱۱۔ آنحضور ﷺ کے اسماء مبارکہ کے لئے دیکھئے، سیرت طیبہ کے اسماء، والقاب کے آئینہ میں، سید محمد عبداللہ، نقوش (رسول نمبر) ادارہ فروغ اردو، لاہور، جنوری ۱۹۸۴ء، ۹/ ۱۳۰

۱۲۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی بار اول، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء ۹/ ۴۳

۱۳۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی بار اول، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء

۶/۲۴۱-۲۴۲

۱۴۔ ایضاً، ا/ ۲۴۲

۱۵ ایضاً ا/ ۴۲

۱۶۔ ایضاً ا/ ۴۲-۴۳

۱۷۔ ایضاً ا/ ۱۶۸-۱۶۹

۱۸۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی بار اول، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ۵/ ۴۴۳

۱۹۔ ایضاً ۵/ ۱۴-۱۵

۲۰۔ ایضاً ۶/ ۲۳۸

۲۱۔ ایضاً ا/ ۱۲۵

۲۲۔ "مصد قالم بین یدیہ" پر تفصیل کے لئے دیکھئے مصد قالما بین یدیہ کی صحیح تاویل بدرالدین اصلاحی۔ الاصلاح، دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۳۶ء، ا/ ۱۱، ص ۲۷-۴۰

۲۳۔ ایضاً ا/ ۱۴۴

۲۴۔ مفردات القرآن۔ المعلم عبدالحمید الفراہیؒ (باعتناء: عبدالاحد الاصلاحی)، مطبع اصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، الہند، ۱۳۸۵ھ ص، ۴۸۰

۲۵۔ دیوان حاتم طائی (تحقیق و شرح: کرم البستانی) مکتبہ صادر، بیروت، ص ۱۳۴

۲۶۔ تدبر قرآن، ا/ ۱۴۵

۲۷۔ دیوان زہیر بن ابی سلمی (تحقیق و شرح، کرم البستانی) مکتبہ صادر، بیروت، ۱۹۵۳ء ص ۱۳۴

۲۸۔ تدبر قرآن، ا/ ۱۴۵-۱۴۶

۲۹۔ ایضاً، وضاحت کے لئے دیکھئے، ا/ ۱۴۶-۱۵۰

۳۰۔ ایضاً، ا/ ۱۴۹

۳۱۔ ایضاً، ا/ ۱۴۳-۱۴۴

۳۲۔ ایضاً، ا/ ۴۳۔۴۴

۳۳۔ ایضاً، ا/ ۴۴۔۴۵

۳۴۔ ایضاً، ا/ ۴۵، مزید تفصیل کے لئے دیکھئے، مفردات القرآن، المعلم عبدالحمید فراہی، مطبع الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ، الہند، ۱۳۵۸ھ، ص ۲۸۔۲۹

۳۵۔ ایضاً، ا/ ۱۷۶

۳۶۔ تدبر قرآن، امین احسن اصلاحی، بار اول، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ۴/ ۴۳۹

۳۷۔ ایضاً، ا/ ۱۴

۳۸۔ ایضاً، ا/ ۱۴

۳۹۔ ایضاً، ا/ ۵۱

۴۰۔ ایضاً، ا/ ۱۴۱

۴۱۔ ایضاً، ا/ ۱۴۱

۴۲۔ ایضاً ا/ ۴۹

۴۳۔ مفردات القرآن، ص ۵۲

۴۴۔ تدبر قرآن، ا/ ۴۰۰

۴۵۔ دیوان النابغۃ الذبیانی (تحقیق وشرح: کرم البستانی) مکتبہ صادر، بیروت، (بدون تاریخ)، ص ۱۸۴

۴۶۔ تدبر قرآن، ا/ ۴۰۰۔۴۰۱، مولانا فراہی کا رسالہ "الرائع فی اصول الشرائع" ابھی مخطوطہ کی صورت میں ہے۔ اس کے لئے دیکھئے:
علامہ حمید الدین فراہی: حیات وخدمات (مرتبہ عبیداللہ فراہی) دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء ص ۶۶۔۶۷

۴۷۔ شرح، بوان جریر، محمد اسماعیل عبداللہ الصاوی، دار الانس، بیروت، ا/ ۵۵۴

۴۸۔ مفردات القرآن، لحمید الدین فراہی، پر راقم السطور کا مقالہ دیکھئے: